انتظار حسین

ہند اسلامی تہذیب میں روشن خیالی کی روایت

پہلے تو مجھے اس شرف کے لیے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ مَیں جید عالم خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے آپ سے مخاطب ہوں۔ مَیں اس پر خوش بھی ہوں اور ایک احساسِ کمتری بھی مجھے ستا رہا ہے۔ بھلا مَیں اس شرف کے قابل کب تھا! یادگاری خطبہ اور پھر خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے! محترم خلیفہ صاحب ہماری حالیہ ثقافتی تاریخ کے ان گنے چنے اہلِ دانش میں سے ہے جنھوں نے ہماری فکری روایت کو جلا بخشی اور مضامین تازہ سے اس میں وسعت پیدا کی۔ پچھلے دنوں ہوا یوں کہ ان کا گیتا کا ترجمہ میرے ہاتھ آ گیا۔ اس ترجمہ نے تو مجھے لوٹ لیا۔ اُردو میں گیتا کے جو ترجمے ہوئے ہیں اور جو ہمارے محقق خلیق انجم کے اندازے کے مطابق چالیس پچاس کے لگ بھگ ہیں ان میں سے کچھ ترجمے میری نظر سے بھی گزرے ہیں۔ وہ سب ترجمے ایک طرف اور خلیفہ صاحب کا ترجمہ دوسری طرف۔ کس سہولت سے انھوں نے گیتا کے دقیق مضامین کو اُردو کے شعری سانچہ میں ڈھالا ہے اور ویدانتی اصطلاحوں کو کس خوبی سے برتا ہے کہ وہ اُردو محاورے میں حل ہوگئی ہیں۔

مگر اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک سوال کلبلایا کہ خلیفہ صاحب کو تو اسلامی افکار و تصورات سے شغف تھا۔ اسی واسطے سے انھیں رومی اور اقبال کی شاعری سے شغف ہوا۔ مگر گیتا تو ایک مختلف دائرۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر گیتا کے اُردو ترجمہ کو تو ان کے علمی کاموں کے بیچ ایک انمول ہی سمجھنا چاہیے۔ مگر جب میں ایسا سوچ رہا تھا تو مجھے اپنی اُردو شاعری سے

جہاں تہاں سے کچھ شعر یاد آئے، صوفیا کے ملفوظات سے کچھ مثالیں، کچھ اپنے اہلِ نظر کے اِکا دُکا بیانات۔ ارے، مَیں نے سوچا، یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سری کرشن جی کی ذات سے ہمارے اہلِ درد کا اتنا شغف۔ کیوں نہ مَیں اپنے مقالہ کا آغاز اسی مقام سے کروں۔ ہند اسلامی تہذیب میں روشن خیالی کی جو روایت پروان چڑھی ہے، اس کا سرنامہ اس سے بہتر مجھے کہاں سے دستیاب ہوگا۔

اگر مَیں نے یگانہ کا یہ شعر نقل کیا کہ:

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

تو کہا جائے گا کہ یگانہ تو تھا ہی اپنی دینی روایت سے باغی۔ اس کی بات کیسے سند ہوسکتی ہے۔ تو لیجیے مَیں اس شاعر کے شعر نقل کرتا ہوں جن کی دینداری پر ہم میں سے شاید ہی کسی کو شک ہو۔ وہ ہیں، حسرت موہانی۔ کہتے ہیں:

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے انس
دُنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا
مخلوق اِک نگاہِ کرم کی اُمیدوار
مستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شیام کا
گوکل کی سرزمین بھی عزیز جہاں بنی
کلمہ پڑھا جو ان کی محبت کے نام کا
لبریز نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اِک حسنِ مُشک فام کے شوقِ تمام کا

مولانا ظفر علی خاں کے بھی چند ایک شعر سُن لیجیے:

سری کرشن کا مَیں احترام کرتا ہوں
اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں

یہ اہتمام بروئے عقیدۂ اسلام
بحکم صاحب بیت الحرام کرتا ہوں
ہنود بھول گئے ہیں کرشن کی تعلیم
گلہ میں اُن سے یہی صبح و شام کرتا ہوں
وہ جور و ظلم کی بنیاد ڈھانے آیا تھا
مَیں اس کی رسم کو دُنیا میں تمام کرتا ہوں

اپنے شاعروں کو مَیں کہاں تک نقل کروں۔ یہ سلسلہ لمبا ہے۔ بس ایک نعت کا احوال سُن لیجیے۔ اُردو کی نعتیہ روایت میں ایک منفرد نعت گو گذرے ہیں، محسن کاکوروی۔ اُنھوں نے ایک نعت تو ایسی لکھ دی ہے کہ نعتیہ شاعری میں اس کا رنگ سب سے الگ ہے۔ نعت اس طرح شروع ہوتی ہے:

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

اور اب گریز شروع ہوتا ہے:

کیا جھکا کعبہ کی جانب کو ہے قبلا بادل
سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
چھوڑ کر میکدۂ ہند و صنم خانۂ بیرج
آج کعبہ میں بچھائے ہے مصلا بادل

بحرِ امکاں میں رسولِ عربی درِ یتیم
رحمتِ خاص خداوندِ تعالیٰ بادل

لگے ہاتھوں ایک خراجِ تحسین علامہ اقبال کی طرف سے بھی سنتے چلیے۔ وہ سری رام چندر جی کی شان میں ہے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

اور ہاں علامہ نے سرکشن پرشاد کو ایک خط میں یہ بھی بتایا تھا کہ ''میرا ارادہ اُردو میں رامائن لکھنے کا ہے۔'' [۱]

نثری ادب میں بالخصوص صوفیا کے ملفوظات میں ایسے بیانات جا بجا نظر آئیں گے۔ ایک بیان مجھے زیادہ معنی خیز نظر آتا ہے کہ اس میں ایک بڑے صوفی اور بڑے عالمِ دین دونوں شامل نظر آتے ہیں۔ یہ بیان نسیم انصاری نے اپنی کتاب ''جوابِ دوست'' میں نقل کیا ہے۔ نسیم انصاری بتاتے ہیں کہ وہ درسِ نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے چھوٹے بھائی ملا رضا کی نویں پشت میں سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ملا نظام الدین نے حضرت سیّد عبدالرزّاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس پر پورے فرنگی محل میں انگلیاں اٹھیں۔ خاندان کے سب ہی بزرگوں نے بہت تعجب کیا اور نکتہ چینی کی کہ عبدالرزاق بانسوی تو جاہل ان پڑھ ہیں۔ نظام الدین ایسے عالم فاضل کو ان سے بیعت ہونا زیب نہیں دیتا۔ یہ اعتراض چھوٹے بھائی ملا رضا نے ان تک پہنچایا۔ ملا صاحب نے جواب دیا کہ تم خود جا کر ان سے ملو۔ پھر ہم سے بات کرنا۔ بانسہ لکھنؤ سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ملا رضا اس سفر پر روانہ ہوئے۔ آخر میں کچھ رستہ پیدل طے کرنا پڑا۔ راستے میں دیکھا کہ کچھ عورتیں ایک مرد کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر

[۱] اقبال نامہ، حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔

رہی ہیں اور کچھ گانا بجانا بھی ہو رہا ہے۔ ملا صاحب نے شاید لاحول پڑھ کر آگے جانا چاہا کہ جھرمٹ سے مردانہ آواز آئی۔ ''کہاں جاوت ہو؟ اگر سیّد صاحب کے پاس جاوت ہو تو ان سے ہمرا اسلام کہیو۔'' ملا صاحب کی ملاقات جب سیّد صاحب (عبدالرزّاق بانسوی) سے ہوئی اور انھوں نے راستے کا حال پوچھا تو ملا صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ سیّد صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ ''جانتے ہو وہ کون تھے۔ وہ سری کرشن مہاراج تھے۔''

نسیم انصاری کہتے ہیں کہ ''یہ واقعہ مَیں نے اپنے بڑوں سے کئی بار سنا ہے۔ روایت کی صحت سے قطع نظر جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ تین سو برسوں سے اس قسم کے چرچے ہمارے فرنگی محل میں ہوتے رہے ہیں۔''

یہ جو مَیں نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ انہیں مشتے نمونہ ازخروارے سمجھئے۔ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ کم از کم مَیں نے تو ان سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی نشوونما کر رہی تھی۔

اس نئی تہذیب کے جلو میں روشن خیالی کی ایک نئی روایت کا بھی ڈول پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ قاعدے سے تو یہ عمل اتنی جلدی شروع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مسلمان شہسوار شمشیر بکف مارا مار کرتے ہوئے، برصغیر میں داخل ہوئے اور راہ میں آنے والے علاقوں اور شہروں پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتے چلے گئے۔ دور کی سرزمینوں سے آنے والے شمشیر بکف شہسوار اپنی شجاعت و دلاوری سے لڑائی میں تو جیت سکتے ہیں مگر دلوں کو نہیں جیت سکتے۔ مفتوح شہروں کی خلقت کے دلوں میں تو وہ ہیبت اور ہیبت کے ساتھ نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اس سے قرب کی بجائے مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں تو مغائرت کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ یہ فاتحین ایسے مذہبی عقائد اپنے ساتھ لائے تھے جو مقامی خلقت کے لیے عجیب اور اجنبی تھے۔ بجا کہ جب یہ فاتحین یہاں حاکم بن کر بیٹھے تو حکمرانی کے تقاضوں کو انہوں نے صحیح پہچانا اور لوگوں کے دل جیتنے کے لیے ان سے نرمی کر برتاؤ کیا۔ ہر چند کہ انتہا پسند علما انہیں مشورے دیتے رہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اس حساب سے واجب القتل ہیں۔ مگر اُنہوں نے ایسے سب مشوروں اور سب فتوؤں کو

ایک کان سنا اور دوسرے کان اُڑایا۔

مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ شروع میں تو یہ چہرے مفتوح خلقت کو خونخوار ہی نظر آئے ہوں گے اور مغائرت کی خلیج نے قرب کے امکانات کو کہاں پنپنے دیا ہوگا۔ تو یہ چہرہ جسے مقامی خلقت نے پہلی پہل دیکھا، سیدھے سچے مسلمان کا چہرہ تھا اور نہ اسلام سے ان کا یہ صحیح تعارف تھا۔

مگر ہوا یہ کہ اس سرزمین نے مسلمان فاتحین کے قدم جمانے سے پہلے صوفیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ شاہی دربار تو سجتے سجتے ہی سجے۔ مگر خانقاہیں بہت جلدی قائم ہوگئیں۔ شروع میں تو بس اتنا ہوتا تھا کہ دور کی کسی بستی سے غزنی سے، سمرقند سے، بخارا سے کسی بھی مسلمان بستی سے ایک صوفی نکلا، رنج سفر اُٹھاتا، ہرج مرج کھینچتا سرزمین ہند میں پہنچا اور کسی بھی نگر میں پہنچ کر ہندو خلقت کے بیچ ڈیرے ڈال دیئے۔ اگر آس پاس کسی فاتح کا دربار تھا بھی تو اس سے بے تعلق رہا۔ داتا گنج بخش اور خواجہ مُعین الدین چشتی کی مثالیں بہت سامنے کی ہیں۔ حضرت خواجہ نے دلی سے پرے راجپوتوں کی بستیوں کے بیچ پڑاؤ کیا۔ جب خلافت چشت بابا فرید گنج شکر کو منتقل ہوئی تو اُنہوں نے بھی دارالسلطنت سے دور اجودھن میں اپنا ڈیرا جمایا۔ اور جب حضرت نظام الدین اولیا نے اجودھن میں جا کر ان کے آستانے پر حاضری دی تو اُنہوں نے دیکھا کہ بابا فرید کے ڈیرے پر ہندو جوگی بہت حاضری دیتے ہیں اور روحانی معاملات و مسائل پر ان سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اور بابا ان سے یہاں کی مقامی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ فارسی سے ہٹ کر انہوں نے اس زبان کو اس خلوص سے اپنایا کہ پھر وہی زبان ان کے شعری اظہار کا ذریعہ ٹھہری۔

تو گویا اب یہاں کے لوگوں کو مسلمان کا اصلی چہرہ اور اسلام کی سچی شکل نظر آئی۔ ہاں خود نظام الدین اولیا کی روش بھی اسی طرح کی تھی۔ ان کی خانقاہ میں حاضری دینے والوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی اور ایک ہندو راجکماران کا ایسا گرویدہ ہوا کہ جب وہ چوکھٹ پکڑی تو اسے چھوڑا نہیں۔ اس کے فارسی روزنامچہ کو خواجہ حسن نظامی نے 'نظامی بنسری' کے

عنوان سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ہندو خلقت کے ساتھ سلطان المشائخ کے سلوک کے کتنے قصے اس میں درج ہیں۔ روایت ہے کہ "ایک دن شیخ اپنی خانقاہ کی چھت پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہاں سے جمنا ندی کا کنارہ نظر آ رہا تھا، جہاں ہندو اپنی پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ کسی مرید نے اس طرف اشارہ کیا تو ادھر ایک نظر ڈالی اور بیساختہ کہا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس پر "تاریخ مشائخ چشت" کے مصنف خلیق احمد نظامی نے ٹکڑا لگایا ہے کہ یہ مصرعہ "صرف مذہبی رواداری ہی کا نہیں بلکہ ایک ایسی فکر کا بھی آئینہ دار ہے جس نے ہندوستان کی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کو سمجھ لیا ہو اور جو یہاں کے تہذیبی نقشہ میں ہر دین اور ہر قبلہ گاہ کو دیکھنے کے لیے تیار ہو۔

حضرت نظام الدین اولیا کا زمانہ سلاطینِ دہلی کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین کی دانست میں ہندو تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان ربط و ضبط سلطنتِ دہلی کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اور ہاں امیر خسرو بھی تو اسی زمانے میں اپنا جوہر آشکار کر رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو وہ اس ربط و ضبط کی مثال بنے ہوئے تھے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ فارسی معلیٰ کا شاعر شیریں مقال اپنی زبان و بیان کی بلندیوں سے نیچے اُتر کر دلی کے گلی کوچوں میں گھوم پھر رہا ہے اور عام خلقت کی بولی ٹھولی سے، طور طریقوں سے، ان کے رنگ ڈھنگ سے شناسائی پیدا کر رہا ہے۔ اور شناسائی سی شناسائی۔ پنہارنوں نے گیت کی فرمائش کی۔ ان کے لیے گیت لکھ دیا۔ بھٹیارن نے دہائی دی کہ اے امیر میرا بیٹا ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔ اس کے لیے کچھ لکھ دو کہ دو حرف پڑھ کے کسی قابل بن جائے۔ اس کے لیے خالق باری لکھ دیتے ہیں۔ سا قن حقہ بھر کے سامنے رکھتی ہے اور طعنہ دیتی ہے کہ امیر تم نے اس ڈھڈ و بھٹیارن کے نکھٹو بیٹے کے لیے خالق باری لکھ دی۔ میرے لیے بھی لکھ دو۔ لو اس کے لیے بھی چلتے چلتے کچھ لکھ دیا۔

اسے شاعر کی ہنسی دل لگی مت سمجھو۔ ایک تہذیب اپنی شائستگی اور شستگی کو بالائے طاق رکھ کر عام خلقت کی ثقافت سے میل ملاپ بڑھا رہی ہے۔ سو سمجھ لو کہ یہ دو تہذیبوں کے سنجوگ کی

گھڑی ہے۔ وہ باہم شیر وشکر کے عمل میں ہیں۔ اب سے پہلے ان کے بیچ کتنی مغائرت تھی۔ پتہ ہے راجکمار ہردیو نے خواجہ حسن سنجری سے پہلی ملاقات میں کیا کہا تھا۔ ابھی وہ لڑکا تو تھا ہی۔ دل میں جو بات رڑک رہی تھی وہ اس نے بے سوچے سمجھے اُگل دی۔ کہا کہ ''اے سردار، آپ کی فوج کے آدمیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے وہ جنگلی جانور نظر آتے ہیں۔''

بعد میں بڑے ہو کر جب ہردیو نے یہ واقعہ اپنے روزنامچہ میں نقل کیا تو لکھا کہ حسن سنجری اس پہ بالکل ناراض نہیں ہوئے۔ بس اتنا کہا کہ ''تم نے اپنے راجہ کے فوجیوں کو دیکھا ہے۔ سب قوموں کے فوجی ایسے ہی معلوم ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔''

شہنشاہ بابر کا بھی ایک بیان ملاحظہ کیجیے۔ ''جب ہم آگرہ میں پہلی مرتبہ وارد ہوئے تو ہمارے لوگوں اور یہاں کے لوگوں کے درمیان عجیب نفرت و منافرت پائی جاتی تھی۔ ان کی سپاہ و رعیت ہمارے لوگوں سے دور بھاگتی تھی۔''

پہلا ردِعمل تو یہی ہونا تھا۔ اگر آپ شمشیر و سناں کے ساتھ کسی اجنبی سرزمین میں داخل ہوں گے تو لوگ بڑھ کر آپ کو گلے تو نہیں لگائیں گے۔ دور ہی بھاگیں گے۔ اس لیے مَیں نے یہ عرض کیا کہ اس صورتِ حال کو بدلنے میں بڑا ہاتھ صوفیا کا ہے۔ پھر فاتحین کے اس رویئے کا بھی ہے کہ جب اُنہوں نے اپنے قدم یہاں جما لیے تو انہوں نے اس سرزمین کو جاننے اور یہاں کے لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے متشدد علما کے مشوروں اور فتوؤں پر کان نہیں دھرا۔ ان کے یہاں جو ایک سمجھداری تھی اور اس اجنبی زمین اور اس کے لوگوں کو جاننے سمجھنے کی چیٹک تھی۔ ان کے طور اطوار کو، ان کے مذہب کو، ان کے خیالات و توہمات کو جاننے کی خواہش تھی، اس نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ خود بابر کے یہاں اس سرزمین کے بارے میں کتنا تجسس تھا۔ بابر نامہ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ یہ کسی جنگجو کا بیان نہیں، کسی محقق کا ہے۔ ایک تجسس اس سے اس کے جانشینوں میں منتقل ہوا۔ بابر نے تو گذرتے گذرتے بس یہاں کے جانوروں کو، پھلوں پھولوں کو دیکھا پرکھا اور اپنی تحقیقات کو قلمبند کیا۔ اس کا پوتا دادا سے آگے نکل گیا۔ اسے اس تجسس نے آ گھیرا کہ یہ دیو آسا اور پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔ جن دیوی دیوتاؤں

کو وہ مانتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ گیتا کیا کہتی ہے۔ مہابھارت اور رامائن کونسی داستانیں سناتی ہیں۔ ویدوں، اپنشدوں میں کیا لکھا ہے۔ اور بس ان کے مذہبی صحیفوں کے اور ان کی رزمیاؤں کے ترجمے شروع ہوگئے۔

اگلی نسلوں میں جا کر ایک شہزادہ نمودار ہوا، داراشکوہ۔ وہ اپنے دادا، پردادا سے بڑھ کر نکلا۔ وہ سنسکرت کا عالم بنا اور شیخ اکرام کے بیان کے مطابق ویدانت کا مطالعہ کرتے کرتے ...دوں کے لگ بھگ پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کر ڈالا اور ویدانت اور اسلامی عقائد میں مشترک اجزا و عناصر ٹٹولنے شروع کر دیئے۔

عجب شخص تھا۔ اسلام کی علمی روایت میں جتنا پڑھا ہوا تھا، اس تناسب سے اس نے ویدک روایت میں غواصی کی۔ اس کی ایک تصنیف ہے ''مجمع البحرین''۔ مگر وہ تو خود اپنی ذات میں مجمع البحرین تھا۔ اس کے ترجموں میں سے اس وقت ایک ترجمہ میرے پیش نظر ہے۔ یہ جوگ بسشت کا ترجمہ ہے۔ اس نے اسے فارسی میں ''منہاج السالکین'' کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔ آگے چل کر مولانا ابوالحسن نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا جسے پہلے نولکشور نے چھاپا تھا۔ اب خدا بخش لائبریری نے اسے شائع کیا ہے۔ بسشٹ رشی رامچندر جی کے گرو تھے۔ اور اس کتاب کے اصل مصنف ہیں، بالمیک رشی۔ اب کتاب سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بالمیک کا ایک شاگرد تھا بھردواج۔ اس نے ایک دن گڑگڑا کر استاد سے پوچھا کہ ...ے حضور رام چندر معرفت اور آزادی میں کہ جیون مکت ہے کامل ہو کر راج کاج میں کس طرح جی لگاتے تھے۔ بالمیک بولے کہ بچہ، رام چند کی حکایت جو پوچھی، تجھ سے بیان کروں گا اور اس کے سننے سے تیری ناواقفیت جاتی رہے گی۔''

اور یہ بیان اس طرح شروع ہوتا ہے ''اے صاحب جہان کو جو آسمانوں کی رنگت کی طرح وہم اور خیال ہے، ایسے بھول جانا چاہیے کہ پھر اس کی یاد نہ آوے۔ اور جب تجھے یقین ہو گیا کہ جہانِ وہم اور خیال ہے اور درحقیقت اس کا وجود نہیں۔ چاہیے کہ تو خاطر کا تعلق اس سے دور کر۔ اور جب یہ امر تیرے دل میں بیٹھ گیا تو انتہا درجہ کا حظ کہ رہائی کا پھل ہے تجھے

حاصل ہوگا۔ اور سب سے اچھی راہ رہائی کی یہ ہے کہ باسنا (خواہشات) کو تو بالکل رفع کر دے۔"

آگے چل کر اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک شخصیت پیدا ہوئی، وہ تھے مرزا مظہر جانِ جاناں۔ ان کے تیور بھی داراشکوہ والے تھے۔ کسی نے اہلِ ہند اور ان کے مذہب کے بارے میں سوال کیا۔ اس کا جو جواب دیا اس کے خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو بے سوچے سمجھے کافر کہہ دینا اچھی بات نہیں۔ قرآن کہتا ہے ولکل امة للرسول۔ سرزمینِ ہند میں نبی اور رسول بھیجے گئے، جن کے احوال اُن کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ کمال ہستیاں تھیں۔ ہماری شریعت بہت سے انبیا کے باب میں خاموش ہے۔ سو ہمارے لیے بھی ان انبیا کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر تعصب سے ہم کام نہ لیں تو ان کے بارے میں نیک گمان ہی رکھنا چاہیے۔

مرزا مظہر جانجاناں کا یہ بیان جس طرح "رودِ کوثر" میں نقل ہوا ہے، خاصا طویل ہے جسے مَیں نے کاٹ چھانٹ کر مختصر کر دیا ہے۔ اس میں ایک آدھ ایسا مقام بھی آتا ہے کہ جہاں سوچنا پڑتا ہے کہ کیا اس بزرگ کی اس تعبیر یا توضیح کو اسی طرح قبول کر لینا چاہیے۔ مثلاً ہندومت کے مقدس صحیفوں کا احترام برحق۔ یہ بھی ماننے میں کیا مضائقہ ہے کہ وہ ہندومت کے سیاق و سباق میں سچائی کے حامل ہیں۔ مگر جب مرزا مظہر جانِ جاناں ویدوں کو آسمان سے نازل ہونے والے صحائف بتاتے ہیں اور اسلام کی مذہبی روایت کے حضرت جبریل کے متوازی برہما کو ایک فرشتہ بتاتے ہیں جو اس وحی کو لے کر آیا تو یہ بات کسی قدر دُور از کار نظر آئی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہ مفکرین خلوصِ نیت سے اور وسعتِ قلب کے ساتھ اُن مذہبی روایت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جس سے اب انہیں پالا پڑا تھا۔ مگر یہ لازم نہیں ہے کہ وسعتِ قلب کے نام پر ان کے ہر بیان کو اور ہر تعبیر کو ہم بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ بلکہ روشن خیالی کی اس روایت کا جس کی انھوں نے بنیاد رکھی تھی، تقاضا یہ ہے کہ اس کے بارے میں سوال اُٹھائیں اور ان کی تعبیرات کو جانچیں، پرکھیں۔ بے شک ردّ کر دیں۔ مگر ان پر کفر کا فتویٰ نہ

لگائیں۔

اصل میں یہ جو ہمیں اپنی تہذیبی اور فکری تاریخ میں دو متضاد روئے نظر آتے ہیں، ایک یکسر ردّ اور انکار کا اور ایک افہام و تفہیم کا، تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ آخر انسانی فکر سیدھوں سیدھ تو نہیں چلتی۔ جب کسی چیلنج کا سامنا ہوتا ہے تو ردِّعمل میں مختلف رویئے سامنے آتے ہیں۔ اس وقت نو وارد مسلمان ایک نئی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ ان کی تہذیب سے یکسر مختلف ایک پوری تہذیب، ایک پورا نظامِ عقائد ان کے روبرو تھا۔ اس سے اغماض تو نہیں برتا جا سکتا تھا۔ ایک ردِّعمل تو سیدھا سادھا تھا کہ یہ سب کفر ہے۔ مگر یہ تو ایک ردِّعمل تھا۔ اس کے سوا بھی کچھ ردِّعمل سامنے آئے۔ کفر والے ردِّعمل سے ہٹ کر ایک ردِّعمل یہ تھا کہ یہ جو ہمارے اردگرد تہذیبی مظاہر پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے جڑا اعقائد، توہمات، اور تصورات کا ایک سلسلہ نظر آ رہا ہے، اسے سمجھنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ردّ و قبول کا عمل اس کے بعد شروع ہونا چاہیے۔

ان مختلف اور متضاد رویوں کی آویزش نے نئے نئے گل کھلائے اور نئی نئی پیچیدگیاں اس سے پیدا ہوئیں۔ کفر کی تہمتوں، فتوؤں کے جواب میں جارحانہ ردِّعمل صوفیا کی طرف سے نہیں، شاعروں کی طرف سے آیا۔ اُردو کے سوا بھی ان مختلف شعری روایتوں میں یہ ردِّعمل نظر آئے گا جنھوں نے مسلمانوں کے زیرِ اثر فروغ پایا ہے۔ مثلاً پنجابی کی شعری روایتوں میں۔ مگر میرے سامنے اس وقت تخصیص سے اُردو کی شعری روایت ہے۔ خاص طور پر کلاسیکی غزل کی روایت۔ یہاں جیسے شاعر نے کفر کی تہمت کو اپنے لیے تمغۂ امتیاز اور وجۂ افتخار بنا لیا ہے اور جواب میں کہہ رہا ہے:

دیکھنا غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

اوروں کو جانے دیجیے۔ علامہ اقبال کو دیکھیے۔ کس لطف کے ساتھ اپنے لیے کافر ہندی کا لقب استعمال کرتے ہیں:

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خوں ریز

اس شعری روایت کا ذرا احتیاط سے جائزہ لیں تو یوں لگتا ہے کہ یہاں تعصب، تنگ نظری اور عدم رواداری کے خلاف ایک تحریک مزاحمت جاری ہے۔ تعصب و تنگ نظری کے علمبرداروں کو جن القاب سے نوازا گیا ہے وہ یہ ہیں: شیخ، واعظ، ناصح، زاہد تنگ نظر، ملا۔ زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا۔

سمجھ لیجیے کہ مختلف اور متضاد رویوں کی یہ آویزش ایک جدلیاتی عمل تھا جس کے تحت ایک نئی فکر کے لیے زمین ہموار ہو رہی تھی اور رفتہ رفتہ روشن خیالی کی ایک روایت نمو پا رہی تھی۔

اور اب مَیں سوچ رہا ہوں کہ یہ جو آگے چل کر سر سیّد تحریک اپنے جلو میں روشن خیالی لے کر آئی تھی اسے اسی تسلسل میں دیکھا جائے یا یہ کوئی الگ رنگ کا پھل تھا اور اس کے محرکات مختلف تھے۔ مگر یہ تو دوسرا مضمون شروع ہو گیا جو ایک الگ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔

اس روشن خیالی کی روایت میں مجھے کچھ واقعات بہت دلچسپ اور معنی خیز نظر آتے ہیں۔ اس وقت کچھ صوفیا کے خواب میرے پیشِ نظر ہیں۔ داراشکوہ نے بشسٹ رشی کو جو سری رام چندر جی کے گورو تھے خواب میں دیکھا۔ کیا دیکھا کہ رشی جی ہیں اور ان کے برابر ایک نوجوان کھڑا ہے۔ رشی جی اس نوجوان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کی یعنی داراشکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رام چندر، اس نوجوان سے مل، یہ تیرا بھائی ہے۔

دوسرا خواب یوں ہے۔غوث علی شاہ قلندر گھومتے پھرتے ہر دوار میں جا نکلتے ہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ سر منڈا کر وہ بھی جوگیوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک خواب دیکھتے ہیں کہ جیسے گنگا کے کنارے ایک بڑا دربار آراستہ ہے۔ اور جیسے یہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار دُربار ہے۔ پھر اسے گنگا پار اسے ایک دربار سجا نظر آتا ہے۔ وہ [illegible] کر اس طرف جاتا ہے۔ یہاں سری کرشن کنھیا مور مکٹ پہنے براجمان نظر آتے ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ یہ کس دربار کا بندہ ہے۔ بھٹک کر اُدھر آ گیا۔ آنحضرت صلعم سے مخاطب ہوتے ہیں کہ حضور آپ کے دربار کا ایک بندہ اُدھر آ نکلا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا ارشاد ہے۔ اُدھر سے جواب آتا ہے کہ یہ تم جانو۔ تب سری کرشن مہاراج اس سے مخاطب ہوتے ہیں کہ مورکھ تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔ جس شے کی تلاش میں ادھر آیا ہے وہ تو اس دربار میں پہلے سے موجود ہے جہاں سے تو آیا ہے۔ جا واپس جا۔ کیا تو نے دوئی سمجھی ہے۔ غلط:

پار کہیں تو پار ہے اور وار کہیں تو وار ہے
پکڑ کنارہ بیٹھ رہ، یہیں وار یہیں پار[۲]

بیشک آپ انہیں بے سروپا قصہ کہہ کر ردّ کر دیں۔ مگر پھر وہی نسیم انصاری والی بات کہ روایت کی صحت سے قطع نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ صوفیا، یہ اہلِ دانش، یہ شاعر اپنی جستجو [illegible] کتنے ڈوبے ہوئے تھے۔ اپنے سے مختلف نظامِ عقائد کو، اس تہذیب کو جاننے سمجھنے کے معاملہ میں وہ کتنے پرخلوص تھے کہ اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس میں اپنے آپ کو غرق کر دیتے ہیں اور کس طرح وسیع المشربی کی، تہذیبی اور مذہبی وسیع القلبی کی اعلیٰ مثالیں قائم کرتے ہیں۔ آج کے حالات میں یہ مثالیں ہم سے کیا کہتی ہیں اور کیا تقاضا کرتی ہیں۔

اور ہاں ایک بات اور دھیان میں آئی۔ یہ جو آگے چل کر سرسیّد تحریک اپنے جلو میں روشن خیالی کی اپنی ایک روایت لے کر آئی، اسے اسی تسلسل میں دیکھا جائے یا یہ کوئی الگ رنگ کا پھل تھا۔ مگر یہ تو دوسرا مضمون شروع ہو گیا جو ایک الگ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔

[۲] تذکرۂ غوثیہ۔